بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے یوں تو فتوحات کے بے شمار واقعات سامنے آتے ہیں، لیکن شاید ان میں سب سے دلچسپ فتح وہ ہے جو ٹرائے (TROY) کے محاصرے میں اہلِ یونان کو نصیب ہوئی۔ یونانیوں نے ایک مدت دراز تک ٹرائے کے رہنے والوں کو گھیرے رکھا۔ وہ اپنی ساری قوت و طاقت کے ساتھ کئی مرتبہ ان پر حملہ آور ہوئے مگر ٹروجنز (TROJANS) کے عزم و ثبات نے انہیں ہر دفعہ پسپا کر دیا۔ بالآخر یونانی ہمت ہار بیٹھے اور انہوں نے محاصرہ اٹھا لینے کا فیصلہ کیا۔

عین اس وقت جب کہ وہ بے نیلِ مرام واپس لوٹ رہے تھے چند ذہین آدمیوں نے ان سے کہا: اگر ہماری اور تمہاری دشمن پر فتح حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب ہم دل شکستہ ہو کر بیٹھ جائیں۔ بسا اوقات جہاں قہر و جبروت عاجز آ جاتا ہے وہاں چالاکی اور عیاری کام نکال لیتی ہے۔ اس لیے آؤ اب ذرا اس نسخہ کو آزما کر دیکھیں۔ بددل سپاہ نے جب یہ الفاظ سنے تو اس کی جان میں جان آئی۔ یونانی جانبازوں نے فوراً کاٹھ کا ایک ایسا گھوڑا تیار کیا جو اندر سے کھوکھلا تھا اُس میں بہترین جانبازوں کو چھپا دیا گیا اور باقی فوج قریب کے ویرانوں میں اس طرح منتشر ہو گئی گویا کہ اب وہاں سوائے لکڑی کے گھوڑے کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

ٹروجنز جب صبح اٹھے تو انہوں نے فرحت و انبساط کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا کہ یونانیوں نے محاصرہ اٹھا لیا ہے اور وہ اپنے وطن واپس جا چکے ہیں۔ اس لیے وہ قلعے کی چار دیواری سے نکل کر اس عجیب و غریب گھوڑے کے گرد جمع ہو گئے اور بالآخر انہوں نے اس بات کا

فیصلہ کیا کہ اس مفید اور "کارآمد چیز" کو قلعہ کے اندر لے جانا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہ ہوا کہ جس چیز کو وہ دلچسپ اور اپنے حق میں نفع بخش خیال کر رہے ہیں وہ اُن کے لیے کتنی نقصان دہ اور ہلاکت خیز ہے۔ اُس کے اندر کس قسم کے جارحانہ عزائم انسانی شکل میں چھپے ہوئے ہیں اور وہ اپنی حماقت سے خود بربادی کو کھینچ کر اپنے گھر میں داخل کر رہے ہیں۔

یہ گھوڑا جس وقت قلعہ میں لایا گیا تو اہلِ ٹرائے کے اندر خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بوڑھے، بچے، عورتیں اور مرد اسے آزادی اور حریت کی دیوی سمجھ کر اس کے گرد ناچنے لگے۔ یہ لوگ رنگ رلیوں میں اتنے بدمست ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی ہوش تک نہ رہی وہ یونانی، جو گھوڑے کے اندر چھپے بیٹھے تھے، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اس قلعہ کے محافظ اور پاسبان شراب کے نشے میں چور ہیں تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر تلواریں سونت لیں اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح سب سے پہلے ان لوگوں کو قتل کرنا شروع کیا جن کے سپرد قلعہ کی حفاظت اور پاسبانی کا کام تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس قلعہ کے سارے دروازوں کو چوپٹ کھول دیا۔ یونانی فوج کے وہ دستے جو ارد گرد جنگلوں میں منتشر پڑے تھے وہ اشارہ پاتے ہی جمع ہو گئے اور اُن کی آن میں قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح وہ کام جسے سرانجام دینے کے لیے بڑی سے بڑی قوت بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تھی اُسے عیاری اور چالبازی نے ایک لمحہ کے اندر پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا

دورِ جدید کا استعمار بالکل اسی طرز پر مختلف ممالک اور اقوام کو سرنگوں کرتا ہے۔ البتہ وہ کاٹھ کا گھوڑا استعمال کرنے کی بجائے تہذیب و شائستگی کی پری کو کام میں لاتا ہے۔ اس "پر اسرار شے" کی ظاہری شکل و صورت اُس گھوڑے سے کہیں زیادہ پُرفریب ہے اور اس کا باطن اُس کی بہ نسبت بہت زیادہ کھوکھلا اور تاریک ہے۔ اس کے پیٹ میں اس قدر گنجائش ہے کہ ہر قسم کی بُرائی، ظلم و تعدی اور جارحیت کو آسانی کے ساتھ چھپایا جا سکتا ہے۔ دنیا کی کمزور اقوام تہذیب کے اس دیوِ استبداد کو جو آزادی

اور حریت کی نیلم پری کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے، بڑے ہی اشتیاق کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر اپنے ممالک میں لے جاتی ہیں۔ مگر جب یہ اژدہا وہاں قدم جما لیتا ہے تو پھر اس کے اندر سے جارحانہ عزائم نکل کر ان استقبال کرنے والی بستیوں کو تاخت و تاراج کر دیتے ہیں۔ ان بدنصیب بستیوں کے بسنے والے کچھ دیر تو استبداد کی یہ ہلاکت خیزیاں کیف و مستی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتے ہیں مگر ایک مدت دراز تک مسلسل چوٹیں کھا لینے کے بعد جب اُن کا نشہ کافور ہو جاتا ہے تو پھر وہ بلبلاتے ہیں لیکن فطرت اس وقت ان کی آہ و فغاں سننے کی بجائے اُن سے بڑے ہی طنزیہ انداز میں کہتی ہے:

ایں ہمہ آوردۂ تست!

وہ شخص جو معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ مسلمان ممالک پر استعمار کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے اب تیر و تفنگ کی بجائے تہذیب و تمدن کو استعمال کیا جا رہا ہے استعماریت اب قوت و طاقت کے ساتھ مسلمانوں کو مفتوح نہیں کرتی بلکہ وہ ترقی اور آزادی کی حسین اور دلآویز صورت بنا کر سیم و زر کی جھانجھریں پہنے ان کی طرف لپکتی ہے۔ یہ لوگ بڑی حیرت کی سی سادگی کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے اسے اپنی قوم کے اندر لے جاتے ہیں، وہاں اس کے ساتھ بڑی ہی والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اور قوم کا ہر فرد اپنی قیمتی سے قیمتی متاع اس کے قدموں میں بڑی خوشی کے ساتھ لا ڈالتا ہے۔

آپ پچھلے ایک سو سال کے واقعات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ کیا مغربی استعمار نے تمام مسلم ممالک کے اندر بربادیوں کا ساشرمناک کھیل نہیں کھیلا اور کیا خود ان ممالک کے رہنے والوں نے اہل ٹرائے کی سی حماقت کا مظاہرہ نہیں کیا؟ امت کے جن لوگوں نے استعماریت کی اس یلغار پر مسلمانوں کو متنبہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی باتوں کو رجعت پسندی اور تنگ نظری کہہ کر رد کر دیا گیا۔ انہیں قوم اور وطن کا دشمن گردانا گیا، انہیں ترقی کی راہ میں ایک سنگ گراں سمجھ کر ہٹانے کی کوشش کی گئی۔ اس تہذیب

جدید نے ان لوگوں کو اتنا بدست کر رکھا تھا کہ انہیں اس امر کا کبھی احساس تک نہ ہونے پاتا کہ اُن کے تہذیبی قلعے مسمار کیے جا رہے ہیں۔

اب کچھ عرصہ سے جب کہ اُدھر تہذیبِ مغرب کا طلسم کسی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور ادھر مسلمانوں کا نشہ بھی کچھ اُترنے لگا ہے تو ان کے اندر اپنی تباہی کا احساس اُبھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں استعمار کی ریشہ دوانیوں پر کڑھتے ہیں، اور کبھی کبھی اُن کی یہ کڑھن جھنجلاہٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے وہ جدوجہد بھی کرتے ہیں اور ہر قسم کی قربانیاں بھی دیتے ہیں لیکن اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو پاتے۔

آج سے چند سال پیشتر جب ان کے اندر اپنی بربادی کا احساس بیدار ہوا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ اُن کی یہ بربادی مسلمان ممالک کی غلامی کی وجہ سے ہے چنانچہ انہوں نے ان ممالک کو آزاد کرانے کے لیے نہایت ہی مخلصانہ اور جرأت مندانہ کوششیں کیں اور اس کے نتیجے میں بیشتر ممالک آزاد ہو گئے۔ مگر اس کے فوراً ہی بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ استعمار کی جس غارتگری سے بچنے کے لیے انہوں نے ان ممالک کو غیروں کے چنگل سے آزاد کرایا ہے وہ تو اُن کے اندر اسی طرح موجود ہے اور وہ آزاد ہو کر بھی اس استعمار کی ہوسناکی کی بھینٹ چڑھائے جا رہے ہیں۔ اس صورتِ حال نے مسلمانوں کو بے حد پریشان کر رکھا ہے مگر وہ کچھ سوچ نہیں پاتے کہ آخر وہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کریں۔ پریشانی کے اسی عالم میں کبھی وہ صنعتی اور مادّی ترقی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور کبھی دنیا کے مختلف سیاسی بلاکوں کی طرف دادرسی کے لیے لپکتے ہیں مگر اُن کا اصل مقصد حل نہیں ہو پاتا، اور اُن کی مصیبت جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ یہ چیز ہر مسلمان کے لیے سخت موجبِ اضطراب ہے اور اس لیے دنیا کا ہر حساس دل کسی نہ کسی انداز سے اس پر ضرور غور کرتا ہے۔ ہم بھی ان صفحات میں آج انشاءاللہ اسی موضوع پر چند گزارشات پیش کریں گے اور اُن تدابیر کی نشاندہی کریں گے جن

عمل پیرا ہو کر امتِ مسلمہ مغربی استعمار کی آفت سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔

کسی مرض کا علاج اُس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ مریض کے ماحول کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے۔ اس لیے مسلمانوں کے مرض کی تشخیص کرنے اور اُس کا علاج تجویز کرنے سے پیشتر سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اُن حالات کا جائزہ لیں جن میں مسلمان اور دنیا کی دوسری اقوام زندگی بسر کر رہی ہیں۔

پہلی چیز جو مسلمانوں کے ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ زمان و مکان پر انسان کی فتح نے پوری دنیا کو ایک وحدت بنا دیا ہے۔ انسان اب حالات کے ہاتھوں اس بات پر مجبور ہو گیا ہے کہ وہ وطن و نسل کی تنگ دامانیوں سے نکل کر سیاست و معیشت کی وسیع تر وحدتوں کو اپنی تعمیرِ نو کی اساس بنائے اس لیے دنیا کی جو قوم بھی اب خاکِ وطن کو اپنی پناہ گاہ بناتی ہے وہ زمانے کی دستبرد سے اپنے آپ کو زیادہ دیر تک بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی لہٰذا مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اب قومی، وطنی، نسلی یا لسانی حصار انہیں مغربی یلغار سے کبھی نہیں بچا سکتے۔ اب ایک قوم دوسری قوم سے نہیں ٹکراتی، ایک نسل دوسری کے خلاف صف آرا نہیں ہوتی بلکہ ایک تہذیب دوسری سے نبرد آزما ہوتی ہے اور ایک تمدن دوسرے کے درپے آزار ہوتا ہے۔ آج کشمکش قوموں اور نسلوں کی تنگ حدود سے نکل کر افکار و نظریات کے وسیع میدانوں میں برپا ہے اور اقوام و ملل کی قسمت کے فیصلے اب انہی بنیادوں پر ہوتے ہیں۔

پھر ہمیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ مغرب مادی ترقی کی دوڑ میں اب اتنا آگے نکل گیا ہے کہ مسلمان اس میدان میں کبھی بھی اُسے نیچا نہیں دکھا سکتے۔ ہم یہ اس لیے نہیں کہہ رہے کہ مسلمان دل شکستہ ہوں، بلکہ ہم یہ گزارش صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ حقیقتِ حال سے صرف نظر نہ کریں اور حقائق کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ مسلمان اگر دنیا میں اخلاقی طاقت بننے کی بجائے محض مادی قوت بننے کی سعی کریں گے تو ان کی حیثیت ہمیشہ ایک محتاج اور دست نگر قوم کی سی ہو گی جس کو مغربی استعمار بے زبان گلہ کی

طرح جس طرف چاہیگا بالکل میکانکی طور پر ہانکتا ہوا لے جائیگا لیکن اگر وہ اس کے برعکس خلاق کے بل بوتے پر دنیا میں جینا سیکھیں گے تو پھر وہ نہ صرف خود اس کرۂ ارضی پر ایک رہنما قوت ثابت ہونگے بلکہ اُن کی مقناطیسی کشش جان کے دشمنوں اور خون کے پیاسوں میں سے بھی مخلص رفیق اور دلسوز فدائی تلاش کریگی ۔ اخلاق انسانوں کو آپس میں جوڑتا ہے اور دنیا پرستی انہیں ایک دوسرے کا دشمن بناتی ہے مسلمانوں کا وہ کونسا خطہ ہے جس میں دین و اخلاق کو چھوڑ کر صنعتی اور مادی ترقی کے لیے سرتوڑ کوششیں نہیں کی گئیں لیکن اُن کا جو کچھ حشر ہوا ہے وہ بھی کسی دیدہ ور سے پوشیدہ نہیں ۔ دنیاوی فوائد و لذائذ کے جنون نے اُن کے اندر نہ صرف دشمنی اور رقابت کی آگ بھڑکائی ہے بلکہ انہیں مغرب کا بے دام غلام بھی بنا دیا ہے ۔ اس صورت حال کو جانتے ہوئے یہ عین حماقت ہوگی اگر ہم اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو محض مادی اسباب و وسائل جمع کرنے میں صرف کرتے رہیں ۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی قسمت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے یہ امر پوری طرح ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ان کا تصور دین دوسری اقوام کے تصور مذہب سے بالکل الگ اور جداگانہ ہے ۔ اس لیے دین اور اس کی روایات کے ساتھ ان کی وابستگی کی نوعیت بھی دوسری اقوام سے یکسر مختلف ہے ۔ ان کے ہاں دین خدا اور بندے کے درمیان کوئی پرائیویٹ رابطہ نہیں بلکہ یہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مبدا اور اساس ہے یہ اگر ایک طرف ان کے فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامتی، اخلاق میں مضبوطی اور روح میں لطافت پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اُن کی معاشرت میں حُسن سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدن میں توازن اور معیشت میں عدل و مواساۃ کا ضامن بھی ہے ۔ اس سے مسلمان نہ صرف اپنے قلب کے اندر سوز و گداز پیدا کرتے ہیں بلکہ اسی کی قوت سے وہ دنیا میں سربلند اور سرفراز ہوتے ہیں ۔ یہ دین ان کا ایک ایسا مضبوط ترین حصار ہے جو اُن کی شخصیت کے ہر حملے سے خواہ وہ فکر و نظر کا ہو یا لشکر و سپاہ کا، پوری طرح حفاظت کرتا ہے اس لیے اس دین کو جو اُن کی ساری زندگی پر حاوی ہے ترک کر دینا کوئی سہل اور آسان کام نہیں ۔

قریب قریب یہی تعلق مسلمانوں کا اپنی روایات سے بھی ہے ۔ مسلمانوں کا ماضی بڑا درخشاں اور

تابندہ ہے اور اس اعتبار سے وہ اس دورِ سعید کو جس میں حضور سرورِ کائنات اور آپ کے جلیل القدر رفقاء کار نے اپنی پاکیزہ زندگیاں گزاریں ہمیشہ ایک آئیڈیل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اسی دور کے ساتھ ان کا تعلق بڑا گہرا اور پائیدار ہے۔ انہیں روایات نے مسلمانوں کو اپنی آغوش میں پالا ہے، انہیں کی وجہ سے یہ قوم بغیر کسی خارجی سہارے کے آج تک زندہ چلی آتی ہے، انہیں کے دم قدم سے اس کے اندر زندگی کی حرارت اور کچھ کرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ ان روایات کے نقوش ہیں اس کے شعور کی خارجی سطح پر ہی جگمگاتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ وہ ہیں اس قوم کے جذبات و احساسات کی گہرائیوں میں بھی جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جس چیز نے انسان کے فکر سے لیکر اس کے قلب تک کو مسخر کر رکھا ہو اور جو حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہو اس کی گرفت کو آسانی کے ساتھ کمزور نہیں کیا جا سکتا یہ کام صرف اسی صورت میں سرانجام پا سکتا ہے جب خود قوم کو صفحۂ ہستی سے معدوم کردینے کا ناپاک عزم کر لیا جائے۔

امتِ مسلمہ بلاشبہ اس وقت انحطاط کا شکار ہے لیکن ہم اُسے اتنا بیوقوف نہیں سمجھتے کہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو کر دین اور دینی روایات کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے گی اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مٹانے کا سامان فراہم کرے گی۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسلام پر نہایت پختہ ایمان رکھتی ہے۔ البتہ غیر ملکی سامراج کی جباری اور عیاری نے اور اس کے اپنے گھر کے دانا دشمنوں اور نادان دوستوں نے اسے قوت و استحکام کے اُن لازوال خزانوں سے محروم کر رکھا ہے جو اسلام کے ذریعہ اسے ماضی میں حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہم غیروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اسی کی طرف توجہ دیں اور زبانی اشتغال پر قناعت کرنے کی بجائے بالفعل اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم دین کے معاملے میں اب بالکل یکسو ہو جائیں۔ ہماری اسی یکسوئی پر ہی ہمارے مستقبل کا سارا دارومدار ہے۔ دنیا میں وہ شخص یا قوم کبھی کامیاب و کامران نہیں ہوتی جو

اپنے نصب العین کے معاملے میں مخلص نہ ہو کسی ملت کے لیے سب سے زیادہ افسوسناک صورتِ حال یہ ہے کہ اُس کے قول و عمل کے دو جُدا جُدا رنگ ہوں اور اس کے اقوال سے جو امیدیں بندھتی ہوں خود اس کے عمل سے ٹوٹ جائیں۔ اجتماعی زندگی میں یہ عجیب و غریب نقطہ یاد رکھنے کا ہے کہ نقشۂ زندگی پر جتنی تہذیبیں اُبھریں اور جتنی قومیں کارزارِ حیات میں کامیاب ہوئیں اور پروان چڑھیں وہ سب وہی تھیں جنھوں نے اپنے تصورات کو زندہ رکھنے کے لیے ایثار سے کام لیا۔ پھر جو تہذیبیں مٹیں اور جن جن قوموں نے موت و ہلاکت کی آواز پر لبیک کہا وہ سب کی سب وہ تھیں جن میں اپنے دین و ایمان پر مٹنے کا جذبہ ختم ہو گیا اور انھوں نے مصلحت پسندی اور خود غرضی پر اپنے سارے سیاسی تصورات کو قربان کر دیا۔ اس نصب العین کی عملی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جس سے ہم معمولی سے معمولی لالچ کے تحت انحراف کرنے پر تیار ہو جائیں۔ وہ شخص جو کسی قوم کو یہ سبق دیتا ہے کہ تم ایک دنیاوی منفعت کی خاطر دین کے احکام کو پس پشت ڈال دو یا دوسرے لفظوں میں فرض پر مصلحت کو مقدم رکھو وہ یا تو اس قوم کا بدخواہ ہے یا اگر خیر خواہ ہے تو اتنا سادہ ہے کہ اُس کی سادگی کے ڈانڈے بے وقوفی سے جا ملتے ہیں۔ آخر وہ فرض ہی کیا ہے جس کی بجا آوری مصلحتوں کی قربانی کی طالب نہ ہو۔ فرائض کی کشت تو ذاتی آرزوں اور تمناؤں کے خون سے ہی سیراب ہوتی ہے۔

یہ اصول کوئی ایسا نہیں جو صرف اسلام کے ساتھ مخصوص ہو۔ اس اصول کی کارفرمائی ہم حق و باطل دونوں میں دیکھتے ہیں۔ مغرب کی ترقی کا راز اگرچہ وہ سراسر باطل ہے، اسی اصول میں مضمر ہے۔ اہل مغرب نے جب وطن کو اپنا ایمان ٹھہرایا تو سب کچھ اسی کی خاطر قربان کر دیا اور اب جبکہ انھوں نے سیاسی اور معاشی وحدتوں کو اپنی زندگی کی اساس قرار دیا ہے تو وہ اس راہ میں سب کچھ لٹا رہے ہیں۔ اپنے نصب العین کو خادم بنا کر اور اپنی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر دنیا میں نہ آج سے پہلے کسی کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ کسی ہوش و خرد رکھنے والے انسان کو اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ اس لیے ہم دین کے معاملے میں جس قدر جلد یکسو ہو جائیں اتنا ہی یہ ہمارے حق میں مفید اور بہتر ہے۔

اس امر کا حتمی اور قطعی فیصلہ کر لینے کے بعد کہ دین ہی ہمارا مدار اعلیٰ اور جوہر حیات ہے اور ہمارے مستقبل کا انحصار اسی پر موقوف ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم دین کے حدود سے پوری طرح آشنا ہوں۔ وہ قوم اپنے ملک کی حفاظت کبھی نہیں کر سکتی جسے اس بات کا علم نہ ہو کہ اس کے وطن کی حدود کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور دشمن کی سرحد کس مقام سے شروع ہوتی ہے۔ اسلام اور جاہلیت کے درمیان تفریق کے جو خطوط ہیں جب تک وہ روشن نہیں ہوتے اس وقت تک ہم اسلام کو بطور نظام حیات کبھی نہیں اپنا سکتے۔ ان حدود کے متعین ہو جانے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم پھر پوری قوت طاقت سے ان کی مدافعت کریں تاکہ کوئی چور اور ڈاکو ان کے اندر گھسنے نہ پائے

مغربی استعمار کی یوں تو اسلام کے خلاف ساری سازشیں ہی انتہائی افسوسناک ہیں لیکن ان میں غالباً سب سے زیادہ شرمناک سازش وہ ہے جو اس نے ہمارے دین کی سرحدوں کو توڑنے کے لیے کی ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ اگر ہماری سرحدی چوکیاں مسمار کر دی جائیں تو ہمیں بڑی آسانی کے ساتھ تاخت و تاراج کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جس دن سے وہ ہمارے تہذیبی قلعہ کی بیرونی دیواروں میں شگاف کرنے میں کامیاب ہوا ہے اسی وقت سے اسلام کے قلب و جگر پر تابڑ توڑ حملے کیے جا رہے ہیں اور حالت یہاں تک آپہنچی ہے کہ اب ہر پاگل اور سرپھرا اٹھتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اسلام اور ملتِ اسلام پر شبخون مارتا ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے ان سرحدوں کی حفاظت اور پاسبانی کا انتظام کرنا ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے گھر کے اندرونی حالات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ کی پہلی کوشش یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنی انفرادی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں ——— ہمارے دل و دماغ پر استعمار نے جو اثرات مرتب کیے ہیں اُن کو ہم بالکل مٹا دیں اور اُس رنگ میں پوری طرح رنگ جائیں جس میں ہمیں اسلام دیکھنا چاہتا ہے۔

قلب و نگاہ کو مسلمان بنانا کوئی ایسا آسان کام نہیں جو آن کی آن میں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس کے لیے بڑی ریاضت اور مشقت درکار ہے۔ اس کے لیے آدمی کو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کرنا پڑتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات آدمی جان تک کی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر اپنی کسی خواہش کو قربان کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔

وہ دور جس میں سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں اس اعتبار سے بڑا ہی سخت اور آزمائش کا دور ہے۔ غیر اسلامی افکار و تصورات نے ہماری زندگی کا پوری طرح احاطہ کر رکھا ہے۔ پھر ان جاہلی نظریات کی اساس پر ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہم پر مسلط ہے جس کی گرفت سے ہماری زندگی کا کوئی گوشہ آزاد نہیں۔ ان حالات میں خدا کے دین پر عمل کرنا معاشرت، معیشت اور سیاست کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جس کے محاذوں کا کوئی شمار نہیں اور جس کے آلات کا کوئی شخص بھی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اپنے نفس کے خلاف یہ ہمہ دم آرائی خواہ کتنی ہی مشکل اور دشوار ہو مگر اسلام کے قیام کے لیے یہ ایک ناگزیر منزل ہے۔ جب تک ہم اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو نفس کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں نہیں دے دیتے اس وقت تک استعمار مسلمانوں میں سے بڑی آسانی کے ساتھ اپنے ایجنٹ اور کارندے تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا رہے گا۔ لیکن جس وقت اس نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کے قلب و نگاہ کو اب سوائے اسلام کے اور کوئی چیز مفتوح نہیں کر سکتی اسی وقت اس کی کمر ٹوٹ جائے گی اور اس کے حوصلے شکستہ ہو جائیں گے۔

نفس کے ساتھ اس جنگ کو کامیاب بنانے کے لیے جو خارجی محرکات کام کرتے ہیں ان میں بھی ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہم اس نظریہ کو تو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کا خارجی ماحول ہی اس کے افکار و تصورات کی صورت گری کرتا ہے اور ہمارے نظریات ہمارے ماحول کے رُخِ زیبا کا عکس ہیں لیکن اس بات کے ضرور قائل ہیں کہ سیرت و کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کے لیے انسان کا ماحول کافی حد تک انسان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر زندگی کے اجتماعی ڈھانچے بدل جائیں

تو پھر انفرادی زندگی کو اُس کے مطابق بدل دینا کافی حد تک سہل اور آسان بن جاتا ہے۔ معاشرے کی قوت ایک بہت بڑی قوت ہے اور انسان کے انفرادی رجحانات کے پیدا کرنے اور احساسات کو پلٹنے میں اس کا بہت زیادہ دخل ہے۔ جس قوم یا ملک میں انفرادی نظریات اور اجتماعی افکار برسرِ پیکار ہوں وہ قوم یا ملک کبھی بھی ترقی نہیں کرسکتا۔ ہمارے اجتماعی تخیلات اور انفرادی احساسات میں جو کشمکش عرصۂ دراز سے جاری ہے اُس سے استعمار آج تک ہر قسم کا ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ مسلمانوں کے اندر استعمار کی آبیاری اسی فکری اور عملی خلفشار نے کی ہے تو یہ چیز زیادہ صحیح ہوگی۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے اس کشمکش کو ہر قیمت پر ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی عملی صورت صرف یہی ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے نظامِ اجتماعی کے سارے شعبوں کو یعنی سیاست، معیشت اور معاشرت کو غیر اسلامی اجزاء سے یکسر پاک کرکے انہیں از سرِ نو اسلام کی تحویل میں دے دیں۔ ہم جس حد تک غیر اسلامی اثرات کو زائل کرنے میں کامیاب ہونگے بالکل اسی تناسب سے استعمار پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا چلا جائیگا۔

تعمیرِ نَو کے اس کام میں یہ امر اشد ضروری ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے دین اور اُس کی روایات کے پابند ہوں۔ ہماری ریاستیں اسلامی احکام کے نفاذ کا ذریعہ بنیں، ہماری معیشت اسلام کے عدل وانصاف کا مظہر ہو اور ہماری معاشرت انسانی اخوت اور محبت کا ایک زندہ نمونہ پیش کرے۔ انفرادی زندگی کی جزئیات سے لے کر اجتماعی زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل تک سب میں اسلام ہی ہماری رہنما قوت ہو۔ ہماری زندگی کے کسی گوشے میں اور ہمارے قلب ودماغ کے کسی ریشے میں جاہلیت نفوذ نہ کرنے پائے۔ اس معاملے میں ہم جس قدر زیادہ احتیاط کا ثبوت دیں گے اسی قدر ہماری ملت قوت وطاقت فراہم کرے گی اور سامراجی عزائم کو ناکام بنانے میں کامیاب ہوگی۔

جس قوم کی قومیت دین اور دینی روایات سے تشکیل پائے اُس کے لیے یہ طرزِ عمل اختیار کرنا

بالکل فطری اور ناگزیر ہے۔ قوموں کو ہمیشہ دو قسم کے محرکات وجود بخشتے ہیں۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت داعیات انسانوں کے کسی گروہ کے اندر وحدتِ فکر اور اشتراکِ عمل پیدا کرکے اس کے مختلف اجزاء کو آپس میں جوڑتے اور اُن کے درمیان رابطہ اور ضابطہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن قومیت کے صحیح نشو و نما کے لیے صرف یہی ایجابی محرکات کافی نہیں ہوتے بلکہ اس مقصد کے لیے ایسے جذبات بھی درکار ہیں جو ایک قوم کو اپنی علیحدگی کا شعور بخشیں۔ اُس کے اندر اس احساس کو بیدار کریں کہ اُس کا اپنا ایک مستقل وجود ہے جو اُسے دوسروں سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔

دنیا کی دوسری اقوام نے ان محرکات کو نسل، زبان، رنگ اور وطن میں فراہم کیا ہے اور اب کچھ عرصہ سے وہ انہیں سیاسی اور معاشی وحدتوں میں تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن ان کے برعکس ملتِ بیضا ہمیشہ سے اپنے وجود کے لیے دین اور اس کی روایات کی رہینِ منت رہی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ جو شخص ہمارے ذہن کے اندر رخنے پیدا کرتا ہے وہ درحقیقت ہماری قومیت پر ضربِ کاری لگاتا ہے۔ اور اس طرح وہ افراد یا گروہ جو اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ جاہلیت کا پیوند لگاتے ہیں اُن کی نیتیں اور ارادے خواہ کتنے ہی پاکیزہ اور مقدس ہوں مگر وہ اپنی سادگی یا حماقت سے استعمار کے گھوڑے کو اپنی قومیت کے قلعے کے اندر داخل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

بیجا نہ ہو گا اگر ہم یہاں ایک اُس اعتراض کا بھی جواب دے دیں جو ہمارے اس طرزِ فکر پر لیا ادتمات کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے متجددین جو اسلام اور کفر کے درمیان رشتۂ اتحاد پیدا کرنے کے لیے بڑی شدت سے آرزومند ہیں یہ کہتے ہیں کہ تم اسلام کے دائرہ کو خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہو۔ اسلام کا مزاج امتزاجی ہے اور اُس میں ہر وقت اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ وہ غیروں سے اخذ و جذب کرتا رہے۔

یہ بات بظاہر بڑی دل لگتی ہے اور تاریخ کے بعض واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ذرا گہرائی میں اُتر کر اصل صورت حال کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اخذ و جذب کا وہ عمل جس کی نظیر ہمیں اپنے اسلاف کے ہاں ملتی ہے وہ آج سے بالکل مختلف ہے۔ اُس وقت امتِ مسلمہ ایک زندہ اور متحرک قوت تھی۔ اس کے اندر اتنی توانائی اور حرارت تھی کہ وہ ہر چیز کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنے سانچے میں ڈھال لیتی۔ لیکن آج حالات یکسر مختلف ہیں۔ اِس دور میں مسلمان ہر جگہ مغلوب و مفتوح ہیں۔ تہذیب مغرب وقت کی غالب اور حکمران تہذیب ہے اور اس نے نوعِ انسانی کی نظروں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ اس لیے اب اگر کوئی شخص اسلام کے اندر کفر و الحاد کے کسی جزو یا اجزا کو شامل کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے تہذیبی قلعے میں اُس استعمار کو گھسنے کا موقع دیتا ہے جس کو اسلام اور اس کی مضبوط روایات نے ابھی تک داخل ہونے سے روک رکھا تھا۔

افراد کے درمیان بلاشبہ کسر و انکسار کے ذریعہ مصالحت کی کئی صورتیں نکالی جا سکتی ہیں لیکن یہ عمل افکار و نظریات کے درمیان کبھی بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ جب بھی دو مختلف تہذیبوں کے اجزائے ترکیبی کو باہم جوڑ کر ایک نئی تہذیب کو جنم دینے کی کوشش کی گئی جس میں دونوں کے صالح عناصر ایک خاص تناسب سے جمع کرنا مقصود تھا تو اہلِ دنیا کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ غالب تہذیب کے اجزاء نے فوراً آگے بڑھ کر اپنی قوت اور طاقت کے ذریعہ کمزور اجزاء پر اس طریق سے اپنا عمل شروع کیا کہ یہ اجزاء اپنی حقیقی قدر و قیمت بالکل کھو بیٹھے اور اپنے آپ کو بالکلیہ طاقتور عناصر میں مدغم کر دیا۔

ہمارے ہاں اسلام اور تہذیبِ مغرب کے درمیان مصالحت کی جس قدر کوششیں کی جا رہی ہیں اُن کا تجزیہ کیجیے اور دیکھیے کہ یہ مصالحت اُس اخذ و جذب سے کس حد تک مختلف ہے جس کی مثال ہمیں ماضی میں ملتی ہے۔ وہاں جب بھی کسی تہذیب میں کچھ صالح اجزاء ایسے نظر آئے جو اسلامی

تمدن میں کھپ جانے کی صلاحیت رکھتے تھے توانہیں پہلے تمام غیر اسلامی آلائشوں سے بالکل پاک اور منزّہ کیا گیا اور پھر انہیں اس طرز پر ڈھالا گیا کہ وہ اسلامی تہذیب کا ہی ایک حصہ بن کر رہ گئے۔

اس کے برعکس آج اسلام اور تہذیبِ مغرب میں مصالحت کرانے کے لیے دینِ حق میں اس انداز سے تحریف کی جارہی ہے جس سے اس کی الگ حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دین تہذیبِ مغرب کا ہی ایک منہ بولا بیٹا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمیں دورِ حاضر میں مغربی افکار و نظریات کو اپنانے میں انتہائی درجہ کا عزم و احتیاط درکار ہے۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ امتِ مسلمہ کو مغربی تہذیب کے اُن اجزاء کو بھی جو بظاہر بالکل بے ضرر بلکہ کسی حد تک نفع بخش معلوم ہوتے ہیں قبول کرنے میں خاصا تامل کرنا چاہیے۔ مغربی تہذیب، مادی فلسفۂ حیات کی ہی شارح اور ترجمان ہے۔ اس میں نشست و برخاست اور اکل و شرب کے طور طریقوں سے لیکر زندگی کے اہم سے اہم معاملات تک سب میں مادیت پوری طرح کارفرما ہے اس لیے ہمیں اپنے آپ کو اس تہذیب کے اثرات سے ممکن حد تک بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ ہماری ملت کا استحکام بہت حد تک ہمارے اس طرزِ عمل سے وابستہ ہے۔

یہ تو ہیں وہ تدابیر جن پر عمل پیرا ہو کر ہم امتِ مسلمہ کو داخلی طور پر مستحکم بنا سکتے ہیں تاکہ وہ استعمار کے ہر چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دے سکے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے گھر کے باہر بھی کچھ اس قسم کے انتظامات کرنے چاہییں جو بالواسطہ ملتِ بیضا کی قوت و طاقت کا ذریعہ بنیں۔

اس ضمن میں ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم استعمار کی اُن غلط فہمیوں کا پردہ چاک کریں جو اس نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کی غرض سے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا رکھی ہیں۔

پھر ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مغربی تہذیب اور تمدن کا اچھی طرح تجزیہ کرکے

اس کے نقائص اور عیوب کو لوگوں پر آشکارا کریں تاکہ اس کا طلسم ٹوٹے اور لوگ کسی ذہنی مرعوبیت کے بغیر اس کا مطالعہ کریں۔

اس کے علاوہ ہمیں اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس دور کی بھولی بھٹکی انسانیت کو راہ ہدایت دکھائیں۔ اور اگر بالفرض ہم پوری نوع انسانی کو صحیح راستے پر ڈالنے میں کامیاب نہ بھی ہوں تو کم از کم اُن سعید روحوں تک تو اسلام کا پیغام بالضرور پہنچا دیں جو حق کی تلاش میں نہ معلوم کتنی مدت سے سرگرداں ہیں۔ اور محض بے خبری کے عالم میں اسلام اور دنیائے اسلام کی دشمن بنی ہوئی ہیں

سخت نامناسب ہوگا کہ ہم بات ختم کرنے سے پیشتر اسلام کی ایک بنیادی حقیقت کی صراحت نہ کردیں۔ اسلام بلاشبہ قوت و طاقت کا سرچشمہ ہے۔ یہ امتِ مسلمہ کو داخلی انتشار اور خارجی یورشوں سے پوری طرح محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور نہ صرف محفوظ رکھ سکتا ہے بلکہ اسے ہر قسم کی سربلندی اور سرفرازی بھی عطا کر سکتا ہے۔ اس کے دامن میں پناہ لینے سے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں اور اربوں برکات حاصل ہوتی ہیں مگر ان کے حصول کا سارا انحصار اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اسلام کو کسی دنیاوی غرض کے لیے نہ اپنائیں بلکہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق خالصتہً للہ کے لیے ہو۔ یہ فوائد جن کا ذکر ہم نے گذشتہ صفحات میں کیا ہے اسلام سے وابستگی کے محض ضمنی فائدے ہیں اور یہ اُسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب دین حق کے ساتھ ہم محض اپنے خالق اور مالک کی رضا جوئی کے لیے تعلق قائم کریں۔ یہ دین بلاشبہ ہماری اس دنیاوی زندگی کو بھی بہتر بناتا ہے لیکن اس کی اصل غرض نوع انسانی کو آخرت میں فائز المرام کرنا ہے۔ اس مردِ حق آگاہ نے کس خوبی سے آخرت اور دنیا کے تعلق کو واضح کیا جب اُس نے امتِ مسلمہ کو مخاطب ہو کر کہا:

" اے غافل انسانو! کیا ابھی تک تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے، آخرت اور دنیا کی حیثیت پرندے اور سائے کی سی ہے۔ اگر تم پرندے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو سایہ خود بخود تمہارے قبضے میں آجائیگا لیکن اگر تم پرندے کو چھوڑ کر محض سائے کے پیچھے پڑے رہے تو نہ تمہارے ہاتھ سایہ ہی آسکے گا اور نہ پرندہ۔